بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

یوں تو پاکستان بننے کے ساتھ ہی یہاں جوڑ توڑ اور سیاسی دھڑے بندیوں کا ایک نہایت ہی ناپاک سلسلہ شروع ہو گیا تھا لیکن اس نے جو تشویشناک صورتِ حال اب اختیار کر لی ہے وہ ملک کے ہر بہی خواہ کے لیے انتہائی پریشان کن ہے۔ اس سے نہ صرف ملک کا سارا معاشرہ بری طرح متاثر ہوا ہے بلکہ ملک کے اندرونی استحکام کو بھی سخت نقصان پہنچا ہے اور اس کی بیرونی ساکھ اور وقار کو بھی شدید دھچکا لگا ہے۔ ان حالات میں یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس معاملہ پر نہایت ٹھنڈے دل سے غور کر کے، اس کے اسباب و علل کو معلوم کریں اور پھر اُن تدابیر کو عمل میں لائیں، جن کے ذریعہ اس متلاطم اور مضطرب فضا کو پُرسکون بنایا جا سکے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس ملک کی آزادی مسلمانوں کی قومی امنگوں کی رہینِ منت ہے، وہ ان کی دلی آرزوؤں اور تمناؤں کا مظہر ہے۔ لیکن یہ بات بلاخوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ یہ آزادی جس مختصر گروہ کے ہاتھوں سے آئی، اُن میں سے معدودے چند کو چھوڑ کر، اس بیش بہا نعمت کے اہل نہ تھے۔ پھر اسے جن جن طریقوں سے حاصل کیا گیا، اُن میں سے بھی اکثر و بیشتر اس کے لیے موزوں اور مناسب نہ تھے۔

وہ شخص جس نے تاریخ انسانی کا سلطنتوں کے عروج و زوال سے نہیں، بلکہ تہذیبوں کے فناو بقا کے نقطۂ نظر سے مطالعہ کیا ہے اور قرآنی نظریۂ تاریخ و تمدن کی روشنی میں نوامیسِ فطرت کو سمجھا ہو وہ اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہو سکتا ہے کہ جہاں طلب آزادی و اقتدار کا

محرک محض چند مادی منفعتوں کا حصول ہو، وہاں سیاسی تبدیلی کے اثرات اتنے دُور رس نہیں ہوتے کہ اس سے سارے معاشرے میں کوئی انقلاب آجائے اور زندگی کی تعمیرِ نو کی تدریجی مہم چلنے لگے اس سے حکومت کرنے والے ہاتھ بلاشبہ بدل جاتے ہیں لیکن لوگوں کے فکر و نگاہ کے زاویے جوں کے توں قائم رہتے ہیں۔ نہ عوام کے احساسات بدلتے ہیں اور نہ اُن کے میلانات۔ یہ انقلاب بڑا ہی سطحی ہوتا ہے اور اس سے خیر و شر کے پیمانوں میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس جس انقلاب میں اقدارِ حیات کی تبدیلی کا جذبہ مضمر ہو اور اسی جذبہ کے مطابق اسے رہنما طاقت بھی مل جائے وہ نہ صرف قیادت کو بدلتا ہے بلکہ پوری معاشرت، پوری تہذیب اور پورے تمدن کو بدل کر رکھ دیتا ہے۔ اس سے اگر ایک طرف سلطنتوں کی حدود اور حکومتوں کے دوائر بدلتے ہیں تو دوسری طرف قلب و نظر کی ماہیت بھی تبدیل ہوتی ہے، سوچنے اور سمجھنے کے نئے انداز پیدا ہوتے ہیں۔ خوب و ناخوب کے نئے معیار معرضِ وجود میں آتے ہیں۔ الغرض ایک تہذیب کی جگہ بالکل دوسری تہذیب جنم لیتی ہے۔ یہ انقلاب اپنے نتائج کے اعتبار سے بڑا ہی دُور رس ہوتا ہے۔ اس کی جڑیں انسان کے دل و دماغ میں پیوست، اور اس کی شاخیں انسانی زندگی کی وسعتوں پر پھیلی ہوتی ہیں۔ پھر اس کے برپا ہو جانے کے بعد، اس کے داعیان اس امر کی پوری کوشش کرتے ہیں کہ جس محرک نے انہیں ایک غیر قوم کے چنگل سے اپنے آپ کو آزاد کرانے پر اُبھارا ہے اُسی کی راہنمائی میں وہ اپنی معاشرت، اپنا اخلاق و اجتماع، سیاست و آئین، علم و فلسفہ، غرض اندرونی و بیرونی زندگی کے تمام مناظر و مظاہر کو بدل دیں۔ یہ حضرات اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہوتے ہیں کہ جس انقلاب کے پیچھے تہذیب کو بدلنے کا جذبہ اور داعیہ موجود ہو وہ صرف سیاسی آزادی سے پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچتا اور نہ وہ مجرد ایک نئی ریاست کی تشکیل پر اکتفا کر کے رہ جاتا ہے۔

ہم جب اس اصول کی روشنی میں اپنے اس ملک کی آزادی کو دیکھتے ہیں تو ہمیں یہاں عجیب

تضاد نظر آتا ہے۔ مسلمانانِ ہند میں اپنے وطن کو غیروں کی غلامی سے آزاد کرنے کا جو احساس پیدا ہوا، وہ اُس احساس سے بالکل مختلف تھا جس نے یہاں کی غیر مسلم اقوام کو سرگرمِ عمل کیا۔ اِن کے نزدیک آزادی کی بڑی وجہ یہ تھی کہ غیر ملکی سامراج اُن پر مسلط ہو کر اُن کے ملک کے مال و متاع سے ناجائز فائدہ اٹھاتا تھا۔ یہاں سوال چند مادی منافعوں کا تھا اور ان کا نصب العین بھی اسی قدر تھا کہ کسی طرح بدیشی حکمرانوں کے بجائے دیسی حکمران تختِ اقتدار پر متمکن کر دیئے جائیں۔

اس کے برعکس مسلم قوم انگریز کے تسلط سے آزاد ہونے کی آرزومند اس بنا پر تھی کہ انگریز اس کی تہذیب کا دشمن تھا۔ اُس کے اقتدار سے اس کا کلچر تباہ ہوتا تھا، اُس کی اقدارِ حیات مٹتی تھیں، اس کے تمدن کی رفیع الشان عمارت پیوندِ خاک ہوتی تھی۔ الغرض وہ انگریز کے سائے میں بحیثیت امتِ مسلمہ زندہ ہونے میں سخت دشواری محسوس کرتی تھی اُسے اس امر کا شدید احساس پیدا ہوا کہ ایسی فضا میں اُس کے لیے سانس تک لینا مشکل ہو رہا ہے۔ چنانچہ اُس نے اس ماحول کو بدلنے کے لیے جدوجہد شروع کی۔ اُس کی کوشش کا ہدف درحقیقت صرف ہاتھوں کی تبدیلی نہ تھی، اس کا نصب العین گورے صاحب بہادروں کی جگہ کالے صاحب بہادروں کو اقتدار کی باگیں منتقل کرانا نہ تھا بلکہ اُس کا اصل مقصد یہ تھا کہ وہ انگریز کے لائے ہوئے فلسفۂ حیات کی جگہ اُس فلسفۂ حیات کو اپنائے جو اُسے اسلام نے دیا ہے۔ چونکہ اس راستے میں انگریز مزاحم تھا اس لیے اُس نے اس سے گلو خلاصی کی کوشش کی۔ آزادی اس قوم کے نزدیک مقصود بالذات نہ تھی، بلکہ ایک دوسرے بلند تر مقصد کے حصول کا لازمی ذریعہ تھی۔ اسی بنا پر آزادی ایسی قدرِ مشترک پر بھی، دونوں قوموں کا طرزِ عمل ایک دوسرے سے بالکل مختلف رہا اور دونوں کو آخر کار اپنی اپنی جدوجہد کی راہیں الگ کرنی پڑیں۔

جس طرح مسلم قوم کا نقطۂ نظر انگریزی اقتدار کے متعلق دوسروں سے مختلف تھا اسی طرح انگریز کا اندازِ فکر بھی اس قوم کے لیے بالکل الگ اور جداگانہ رہا ہے۔ اُسے وسیع تاریخی پس منظر

کے ساتھ مسلمانوں کی قومی نفسیات کے مطالعہ سے اس بات کا اچھی طرح علم ہو گیا تھا کہ نیشنلزم اس قوم میں کبھی جڑ نہیں پکڑ سکتا، اور نہ ہی یہ اس قوم کو کبھی ایک انقلابی قوت سے مالا مال کر سکتا ہے۔ اس نے اس قسم کی تحریکات کی ایک حد تک پشت پناہی کرنے کا تجربہ بھی کر لیا جو اس کے اندر سے دینی وحدت کے تصور کو مٹا کر وطنیت اور قومیت کے جذبہ کو ابھاریں لیکن اسے ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے مفاد اور بین الاقوامی منصوبوں کے حق میں یہ صورت واقعہ انتہائی وجہ تشویش تھی کہ اسلام اس قوم کی زندگی کے لیے مبدأ و اساس بنا رہے۔ اس بنا پر وہ ہمیشہ اسلامی جذبے کو مضمحل اور مسخ کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ اس نے اپنی پالیسی کو اسی اصول کے مطابق وضع کیا اور اس امر کی پوری کوشش کی کہ یہ قوم دوبارہ زندگی حاصل نہ کر سکے، اور اگر بالفرض وہ خوابِ غفلت سے بیدار بھی ہو جائے تو اس کارگاہِ حیات میں ایک مسلمان قوم کی حیثیت سے شامل نہ ہو۔

انگریز نے اسی طرزِ فکر کے مطابق ہندوستان میں مسلمانوں کے ساتھ معاملہ کیا۔ وہ یہاں ان جماعتوں اور تحریکوں کی برابر سرپرستی کرتا رہا جو اسلام کو ایک اجتماعی دین اور ایک انقلابی تحریک کی حیثیت سے نمایاں نہ ہونے دیں اور عوام کو گھٹیا درجے کے فرقہ وارانہ، کلامی اور مناظرانہ معرکوں میں الجھائے رکھیں۔ انہیں کی مدد سے وہ اُن اثرات کو مٹانے کا آرزومند رہا جو شاہ اسماعیل شہید اور اُن کے جلیل القدر رفقائے کار کی سرفروشی نے یہاں چھوڑے تھے۔ اس نے ایک طرف تو جاگیرداروں کا ایک ایسا وفادار طبقہ پیدا کیا، جو انگریز کے سیاسی مفادات کا خود انگریزوں سے بڑھ کر خیر خواہ تھا۔ اور دوسری طرف اس نے اسلامی اقدارِ حیات کو ملیامیٹ کرنے اور مغربی کلچر کو لانے کے لیے انگریزی تعلیم کا انتظام کیا۔ وہ اس امر سے بخوبی واقف تھا کہ اُس کے استعماری عزائم کی تکمیل اُس وقت تک ناممکن ہے، جب تک اس کے نظامِ تہذیب و تمدن کی پاسبانی کرنے والا ایک دیسی طبقہ یہاں موجود نہ ہو۔ اس مقصد کے حصول کے لیے اس نے اس بات کی پوری

کوشش کی کہ مسلم قوم کی رہنمائی اور قیادت مغربی اقتدار پر ایمان لانے والے ذہنی غلاموں کے ہاتھ میں منتقل کی جائے۔ اِن لوگوں کو ہر قسم کے دنیاوی اعزاز بخشے گئے۔ اور ایک سوچے سمجھے پلان کے مطابق انہیں عوام پر مسلط کر دیا گیا۔ چنانچہ یہ لیڈر شپ جو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد نوابوں، جاگیرداروں اور سرکاری عہدہ داروں کی شکل میں اُبھر کر ہمارے سامنے آئی ہے وہ اس ملت کی فطری قیادت نہیں بلکہ سراسر مصنوعی ہے۔

انگریز جب اس بات پر مجبور ہو گیا کہ وہ اس ملک کو چھوڑ دے، تو اُس نے اپنے حق میں مناسب یہی سمجھا کہ جاتے ہوئے زمامِ اقتدار ایسے لوگوں کو سونپ دے جو مغربی تہذیب و تمدن میں سراسر رنگے ہوئے ہوں تاکہ وہ اسلام کے راستہ میں مزاحم ہوں۔ چنانچہ اب صورتِ حال یہ ہے کہ ہم بحیثیتِ قوم ہندوستان کی دیگر اقوام سے الگ تو اس بنا پر ہوئے ہیں کہ ہم سیاسی، مملکتی اور تمدنی امور میں مذہبی اندازِ فکر اور مذہبی طرزِ خیال سے ہٹ کر کسی دوسرے طرزِ فکر کے مطابق کام نہیں کر سکتے یا اجتماعی زندگی کی کوئی ایسی شکل گوارا نہیں کر سکتے جو ہمارے مذہبی احساسات و تخیلات سے بالکل متصادم ہو۔

لیکن اس فکر و کاوش کی راہ پر ذرا اور آگے بڑھیے تو انتہائی پیچیدہ صورتِ حال سامنے آتی ہے وہ قوم جو یہ دعویٰ لے کر اٹھی ہو کہ اس کا مذہب اور سیاست ایک ہے۔ اس کی بدبختی کا حال یہ ہے کہ اس کی سیاسی راہنمائی ایک ایسے طبقہ کے ہاتھ میں ہے جو اگرچہ اپنی مخصوص مصلحتوں کے پیشِ نظر کبھی کبھی اسلام کا نام لے لیتا ہے، لیکن جسے نہ صرف مذہب سے کوئی لگاؤ نہیں بلکہ وہ مذہب کا سب سے بڑا مخالف ہے۔ اس طبقہ کے اندازِ فکر سے لے کر رہنے سہنے کے طریقوں تک میں کوئی چیز بھی ہمیں ایسی نہیں ملتی جس سے گمان ہوتا ہو کہ یہ لوگ اسلام کے ماننے والے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مذہب اس غیر اسلامی سیاست کا تابع اور محکوم بن گیا ہے۔ اس سے زیادہ ستم ظریفی اور کیا ہے کہ وہی مسلمان لیڈر جو ہندوؤں کے مقابلہ میں سیاست اور مذہب کی

یکجائی کے دعویدار تھے اور سیاسی میدان میں مرکز گریزی کو قطعاً برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں تھے وہ مذہبی دائرہ میں ہر طرح کے لامرکزی میلانات کو بخوشی و رغبت گوارا کر رہے ہیں۔

دوسری طرف مسلم قوم کے مزاج کا خمیر چونکہ مذہبی احساسات سے تیار کیا گیا ہے اس لیے وہ اس کو نظر انداز کرنے کے لیے کبھی تیار نہیں ہو سکتی۔ اس کی عملی زندگی میں اگرچہ بڑا خلفشار پایا جاتا ہے لیکن مذہب آج بھی اس کے دل کی زوردار جذباتی پکار ہے۔ وہ اگرچہ دین کے اصولوں سے بغاوت اور انحراف کرنے والوں سے نجات پانے اور اپنے فکر و کردار کو جبری انتشار سے بچانے پر قدرت نہ رکھتی ہو لیکن ان حالات پر کڑھتی ضرور ہے۔ اس وقت ملک کی جو صورتِ حال ہے اس میں وہ اپنے خوابوں کی تعبیر نہیں پاتی اور اسے اس بات کا شدت سے احساس ہے کہ اُس کے ساتھ محض ایک مذاق کیا گیا ہے۔ اُس کے جذبات و احساسات سے کھیلنے کی کوشش کی گئی ہے۔ چنانچہ اس پر اس وقت سخت یاس اور نا امیدی کی حالت طاری ہے۔ وہ اپنے مستقبل کو سرا سر تاریک پاتی ہے۔ اسے کچھ سمجھ نہیں کہ وہ کیا کرے۔ ہماری اس وقت کی حالت اُس بدنصیب کشتی کی سی ہے جس کے کھینے والوں نے ہمت ہار کر خود اپنے ہاتھوں سے چپو توڑ دیئے ہوں اور وہ اس کے نفع و نقصان سے بالکل لاپرواہ ہو کر محض ایک تماشائی کی حیثیت سے سمندر کے تھپیڑوں کو دیکھ رہے ہوں۔ یہ لوگ اب اتنے بے حس ہو گئے ہیں کہ خود ان کا اپنا سفینۂ حیات موجوں کی لپیٹ میں ہے، لیکن وہ اس سے بالکل بے تعلق سے ہوئے جا رہے ہیں۔ حیاتِ انسانی میں یہ جمود اور عدم دلچسپی ملت کے حق میں انتہائی تباہ کن ہے۔ ممکن ہے انقلابی کونسل ایسی احمقانہ تجاویز پیش کرنے والے حضرات اسے اپنے لیے نیک فال خیال کرتے ہوں لیکن ملک کا کوئی حقیقی خیر خواہ اس پر اطمینان کا اظہار نہیں کر سکتا۔

ہم جب مایوسی کی اس عام فضا کے اسباب پر غور کرتے ہیں تو ہم اس کی ایک بڑی وجہ یہ

یہ پاتے ہیں کہ اس وقت جو قیادت ہم پر مسلط ہے وہ نہ تو ہماری قومی امنگوں کی مظہر ہے اور نہ ہی ہمارے احساسات و جذبات کی ترجمان۔ اس کے برعکس ہر ثانیہ ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ اسے ہم پر ٹھونسا ہی اس لیے گیا ہے کہ وہ ہمارے عزائم کو کچلے۔ ہم کسی اور سمت بڑھنا چاہتے ہیں اور یہ قیادت ہمیں اس سے بالکل مخالف سمت میں سازشوں اور سنگینوں کی مدد سے دھکیلتی چلی جا رہی ہے۔

پھر معاملہ یہیں پر ختم نہیں ہوتا۔ پچھلے چند سالوں کے تجربات سے ہمارے اندر یہ احساس بھی پیدا ہو چکا ہے کہ ہم اس قیادت کو تبدیل کرنے کی طاقت اور قوت نہیں رکھتے۔ جو ہاتھ اس کو ہم پر مسلط کیے ہوئے ہیں وہ ہم سے کہیں زیادہ مضبوط اور قوی ہیں اور ہم اُن کے سامنے بالکل بے بس۔ اس لیے ہمیں اس خیال کو دل سے نکال دینا چاہیے کہ ہم کبھی بھی اپنی پسند کے لوگوں کو اس ملک کی زمام اقتدار سونپ سکیں گے۔

تیسرے اس قیادت نے اپنی ہی قوم کے ساتھ ایسا شرمناک کھیل کھیلا ہے جس کی توقع کسی غیر ملکی سامراج سے بھی بہت کم کی جا سکتی ہے۔ اس نے محبت اور دوستی کے رشتے اُن قوموں سے اُستوار کیے جن کے مظالم کی یاد ابھی اس مظلوم قوم کے دل سے محو نہیں ہوئی۔ اس نے اس غریب اور نادار قوم کی دولت کو اس بے دردی سے اڑایا، جیسے کہ یہ کوئی دشمن کا مال تھا۔ اس نے اپنے ہی بھائیوں میں کبریائی کے ٹھاٹھ جمائے۔ الغرض اُن سب چیزوں کو بالقصد کیا جس سے اس کے زخموں پر نمک پاشی ہوتی ہو۔

یہ وہ بنیادی وجوہ ہیں جنہوں نے ہمارے اس ملک میں بددلی کی ایک لہر دوڑا دی ہے اور جس سے ہر حساس دل متاثر ہے اور اس پر مایوسی کی کیفیت طاری ہو رہی ہے۔

اس صورت حال کو بدلنے کے لیے سب سے ضروری چیز یہ ہے کہ ملک کی بد عنوان قیادت سے کام لے کر اس قیادت کو تبدیل کیا جائے اور ایک ایسی قیادت کو خود عوام میں سے ابھارا جائے جو انہیں میں سے ہو اور اس بنا پر وہ نہ صرف عوام سے ہمدردی رکھتی ہو بلکہ اُن کی دلی